غالب کی صدسالہ تقریبات

کے موقع پر

عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر جمہوریۂ ہند

کا

خطبۂ افتتاحیہ

۱۶؍فروری ۱۹۶۹ء

URC
2949

آج ہم مرزا غالب کی وفات کی سو سالہ برسی منا رہے ہیں اور دنیا کے کئی ملک اس مبارک تہذیبی کام میں ہمارے ساتھ شریک ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے سب منتظر تھے کہ یہ وقت آئے، تو جو کچھ ہو سکتا ہو کریں اور ان کے منصوبوں میں خلوص کی ایک شان نظر آتی ہے جس سے بہت کم شاعروں کو نوازا جاتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اب غالب کا کلام ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا جو مقام ہماری تاریخ اور تہذیب میں ہے وہ نمایاں ہو جائے گا اور نمایاں رہے گا۔

غالب کو ایک تہذیب ورثے میں ملی تھی جسے انھوں نے اس طرح اپنایا کہ اس کا ایک کامل نہیں تو مثالی نمونہ بن گئے۔ ہمیں اب یہ تہذیب ہندوستان کی سماجی تاریخ کا دور معلوم ہونے لگی ہے اور ہم بھول جاتے ہیں کہ اس کی بنیاد کیسے اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر تھی۔ ایک اصول تھا انسان سے محبت کرنا۔ غالب نے اس اصول کو دل سے مانا اور اس پر عمل کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں، دوسرا مانے یا نہ مانے۔"

اسی محبت نے انھیں اپنی تہذیب کے دوسرے اصول پر عمل کرنا سکھایا، اُن کے دل میں فیاضی اور خیر خواہی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ جو کچھ اپنے پاس ہوتا

بے سوچے بلکہ بے اختیار ضرورتمند کو دینے کے لیے تیار ہو جاتے، کوئی فقیر اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا، دوست کی مال سے مدد کرنا اپنے لیے بڑی سعادت جانتے تھے، عزیزوں کی پرورش کی ذمہ داریاں برابر بڑھاتے رہے۔ ان کی آرزو تھی کہ ایک عالم کے میزبان بنیں اور یہ ممکن نہ ہو تو کم ازکم جس شہر میں رہتے ہوں اس میں کوئی بھوکا اور ننگا دکھائی نہ دے۔ یہ تھے ان کے حوصلے جبکہ اُن کی آمدنی ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار تھی اور گھر کا خرچ مشکل سے چلتا تھا۔ شاید فیاضی کرنا ان کے لیے اتنا ہی لازمی تھا جتنا کہ جینے کے لیے سانس لینا۔ اور ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اگر کہیں اعمال اور نیت کا حساب رکھا جاتا ہے تو غالب کی فیاضی کا حساب روپے آنے پائی میں نہ رکھا جائے گا بلکہ یہ مانا جائے گا کہ ایک گنہگار بندے کے دل میں اس کے رب کی ربوبیت کا عکس نظر آتا تھا اور وہ اپنے حاجت مند بھائیوں کی حاجت پوری کرنے کی ایسی آرزو رکھتا تھا کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا اور کر نہ پایا، اس کا بھی اسے ثواب ملنا چاہیے۔

فیاضی اور خلوص کا ساتھ چولی دامن کا سا ہے۔ غالب کا خلوص ایک طرف اس سادہ ہمت میں نظر آتا ہے جس سے اُنھوں نے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا۔ دوسری طرف ان کی دوستداری میں اور اس اعلیٰ مرتبے میں جو اُنھوں نے وفاداری کو دیا، کون تھا جو غالب کی کسی عادت کو، جا ہے وہ عام طور پر بری مانی جاتی ہو معاف نہ کر دیتا جب وہ اپنے پیارے طریقے پر اس کا ذکر کرتے۔ اور کون ہے جو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالے گا کہ اصل چیز دل کی صفائی ہے عیبوں کی ناپ تول نہیں ہے۔ دوستوں سے غالب کو جو لگاؤ تھا، جس بے چینی سے وہ ملاقات کے اور ملاقات نہیں تو خط کے منتظر رہتے تھے اس کا حال ان کے خطوں سے معلوم کیجیے تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاش ہم بھی دوست رکھتے

اور ان سے اسی طرح محبت کر سکتے۔ دراصل آدمی دوست نہ رکھتا ہو اور دوستی کا حق نہ ادا کر سکتا ہو تو اس کا کوئی مذہب کوئی دھرم نہیں ہوتا:

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یہ وفاداری کس سے ہوگی۔ خدا سے، اصول سے یا دوست سے؟ شاید غالب کا جواب یہ ہوتا کہ کوئی مسلمان کہے کہ میں مسلمان ہوں اس لیے مجھے پسند کرو، کوئی ہندو کہے کہ میں ہندو ہوں اس لیے مجھے پسند کرو، تو بھی یہ بات میرے جی کو نہیں لگتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو آدمی دوسروں کے ساتھ وفاداری اور خلوص نہ برتے وہ تسبیح اور جنیو کو خدا اور انسان کو پھانسنے کے لیے ایک پھندا بناتا ہے۔

خلوص اور دوستی کا ایک سماجی اور تہذیبی پہلو تھا جسے حقِ صحبت کہتے تھے۔ اسی کا رس نکال دیا جائے تو وہ چیز باقی رہ جاتی ہے جسے ہم رواداری کہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے کافی ہو سکتی ہے؛ غالب کی نظر میں کچھ اور تھا۔ اپنے مسلمان ہونے کا عذر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

غالب کی شخصیت جس تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اس کا نقشہ بگڑ چلا تھا۔ مگر معیار یہ تھا کہ حقِ صحبت ادا کیا جائے۔

قدرت کا کوئی ایسا قانون نہیں ہے جس کے مطابق خاص حالات کسی خاص قسم کے انسان کو پیدا کرتے ہوں۔ اگر بہت سے لوگوں پر حالات کا ایک سا اثر پڑتا ہے تو ایسی بھی کافی مثالیں مل جاتی ہیں جو عام نمونوں کے خلاف ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ غالب کے دل میں فن میں کمال حاصل کرنے کا حوصلہ

ان کے زمانے کی تہذیب نے پیدا کیا۔ اسی وجہ سے انھوں نے شروع ہی سے اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی، عام راستے سے ہٹ کر، اُردو اور فارسی کو اپنے خاص طرز پر ملا کر ایک نئی اور انوکھی زبان بنائی۔ جب اس زبان سے بھی طبیعت مطمئن نہ ہو سکی تو فارسی میں لکھنا شروع کیا اور پھر اسے بھی چھوڑ کر اس زبان میں شعر کہنے لگے جسے اب سُنتے ہی ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ غالب کی زبان ہے۔ ہمیں اس پر فخر ہے کہ یہ زبان ہماری زبان ہے، اس میں چاشنی ہے، رنگینی ہے، لچک ہے، روانی ہے۔ اس میں دوستی کا وہ مادّہ ہے جو خود غالب میں تھا اور یہ حقِ صحبت بھی غالب کی طرح ادا کر سکتی ہے۔

پہلے دَور میں انھیں احساس تھا اور بعض قدر شناسوں نے احساس دلایا بھی کہ ان کی زبان مشکل اور خیالات پیچیدہ ہیں۔ مگر انھیں یقین تھا کہ لوگ ایک دن ان کے کلام کو ضرور سمجھیں گے اور اس کی قدر کریں گے۔ اس لیے کہ اُن کا نغمہ تخیّل کے جوش نے پیدا کیا تھا۔ اور کوئی بلبل اس طرح نغمہ سرا ہو تو کوئی موجود باغ اس کے شایانِ شان نہیں ہوتا۔ مگر غالب اپنی دنیا سے الگ نہیں تھے بلکہ اس میں ایک نغمے کی طرح سرایت کر گئے تھے۔ کہتے ہیں:

جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے

کس کا دل ہوں کہ دو عالم میں لگایا ہے مجھے

اسی دَور میں جبکہ وہ جوان تھے اور زندگی کا نشیب و فراز کچھ زیادہ نہیں دیکھا تھا انھوں نے ایک خیال پیش کیا جو عمر بھر کے تجربے اور صدیوں کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے:

عروجِ نا اُمیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے

بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

فارسی کے ایک شعر میں انھوں نے شاعر کا منصب بیان کیا ہے کہ وہ اس دنیا کے

کانٹوں کو اپنے دل کے خون میں رنگ کر دکھاتا ہے کہ باغبانی کس طرح کی جاتی ہے اور پھولوں کی قیمت کس طرح ادا کی جاتی ہے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

شاید یہی وہ منزل ہے جب انسان، جو اپنے بس بھر محبت، خلوص، فیاضی برت کر حقِ صحبت ادا کر چکا ہے سوچنے لگتا ہے کہ آخر وہ ہے کیا، اُسے اپنے آپ کو پہچاننے، اپنے وجود کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ کبھی وہ سمجھتا ہے کہ وہی سب کچھ ہے، کبھی دیکھتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں، کبھی شوق اسے آسمان تک پہنچا دیتا ہے، کبھی مایوسی اسے نڈھال کر دیتی ہے۔ وہ مذہب کا سہارا لینا چاہتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کو، اپنی عبادتوں کو، ایک حد، ایک انتہا سمجھ لیا ہے، خدا تک پہنچنے کی اُمید نہیں رہی ہے، تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

مذہب کا سہارا اس وجہ سے ڈھونڈا جاتا ہے کہ آدمی کی اپنی تمنائیں پوری ہوں، لیکن کبھی وہ دیکھتا ہے کہ یہ تمنائیں بھی اتنی ہیں کہ وہ بے بس ہو گیا ہے، کبھی دونوں جہان کا مل جانا اسے کافی نہیں معلوم ہوتا:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

یا ساری دنیا کو وہ اپنی تمنا کے ایک پیر کا نشان ٹھہرا کر پوچھتا ہے۔

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یا کبھی وہ سوچتا ہے کہ آرزو کرنا آدمی کی پست ہمتی کی دلیل ہے، آدمی دعا مانگے تو سب کے لیے۔

تا چند پست فطرتی طبع آرزو یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

لیکن انسان کی طبیعت میں کشمکش پھر بھی باقی رہتی ہے۔ یہ دنیا سکون کی جگہ نہیں، ایک وحشت کدہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ پناہ مل سکتی ہے تو عشق میں۔ اگرچہ یہ بھی ایک شعلہ ہے۔ برابر جلاتا اور گھُلاتا رہتا ہے؛

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

شاعر فلسفی نہیں ہوتا کہ کسی عقیدے یا نظریے کو دلیلیں دے کر ثابت نہیں کرتا۔ اس کا محرک ایک ہمہ گیر جذبہ ہوتا ہے جسے عشق کہا گیا ہے اور یہ نام ہے ان تمام کیفیتوں کا، ان تمام قلبی واردات کا جو اُس پر گزرتی ہیں۔ ان ہی کو وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اپنے بیان کے ذریعے اپنی کیفیتوں کو دوسروں کی کیفیتیں بنا دے۔ غالب کے عشق میں ہر رنگ ہے، وہ رنگ ہے جس میں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عشق کی بات کر رہے ہیں یا ہنسی مذاق کی یا سیاست کی۔ چند مثالیں لیجیے اور سوچیے کہ غالب کا منشا کیا ہوگا۔

کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور

دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرمائیں گے کیا

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں، کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ   پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ایسے شعر زبان زد ہو جاتے ہیں اور بہت سے موقعوں پر بہت سے مختلف قسم کے لوگوں کے کام آتے ہیں۔ ان ہی کی طرح غالب کے وہ اشعار ہیں جن میں کچھ فلسفیانہ، کچھ مذہبی رنگ ہے، یا درد کی کیفیت ہے اور زبان میں وہ سادگی ہے جس سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے جیسے:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

غمِ ہستی کا اسدؔ کیسے ہو جز مرگ علاج   شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پھر وہ اشعار ہیں جن میں حُسن و عشق کے معاملات ہیں:

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے   سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے   یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

لیکن ایسے اشعار کا لطف اٹھاتے ہوئے ہمیں اس کلام کو مشکل سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا چاہیے جس میں جذبات کو فکر میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ ان کا صرف دل پر اثر نہیں پڑتا بلکہ ان سے دماغ میں بیداری پیدا ہوتی ہے، خیال اور شوق کے مرتبے اور تاثیر کا اندازہ ہوتا ہے، عشق ایک طاقت بن جاتا ہے، جو دنیا کو بنا بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی سکتی ہے:

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے — سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ زندگی میں شاعر اور شاعری کا مقام کیا ہے۔ خدا کرے ہمارے دلوں میں وہ بے چینی رہے جو غالب کے دل میں تھی اور ہم اپنے اپنے طریقے پر انسان اور انسانیت کو ان بلندیوں تک پہنچانے کی کوشش میں لگے رہیں جن کا عکس غالب کے کلام میں نظر آتا ہے۔

اب میں غالب کی صدسالہ یادگار کے سلسلے میں تقریبات کا افتتاح کرتا ہوں۔